اردو شاعری پر ایک نظر

اردو شاعری کا آغاز اردو نثر سے بھی پہلے ہوا۔ چنانچہ امیر خسرو دہلوی (جو اردو کے پہلے شاعر مانے جاتے ہیں) کی شاعری کے جو نمونے ملے ہیں، ان میں ایک مصرع فارسی کا اور ایک اردو کا یا آدھا مصرع اردو اور آدھا فارسی میں ہے۔ اس شاعری کو ریختہ کہا جاتا تھا اور اس کا رواج امیر خسرو کے بعد بھی ایک عرصے تک رہا۔

اردو شاعری کو زیادہ ترقی دکن میں نصیب ہوئی۔ بہمنی سلطنت کے قیام سے وہاں اردو کے مقابلے میں فارسی کو زیادہ اہمیت حاصل ہوئی اور وہ سرکاری دفتروں اور تہذیبی مجلسوں میں جگہ پانے لگی۔ دکنی صوفیاء اور عوام خاص طور پر دکنی سلاطین نے زبان اور شاعری کی ترقی میں بڑا نمایاں حصہ لیا۔ اس سلسلے میں گولکنڈہ کے قطب شاہی اور بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ قطب شاہی خاندان کا سلطان محمد قلی قطب شاہ خود شاعر تھا اور شاعروں کا قدر دان تھا۔ اس کا اردو کلیات موجود ہے جس میں غزلیں اور قصیدے موجود ہیں۔ اس کی غزلوں میں جہاں ایک طرف فارسی غزل کے مضامین اور اسلوب کی جھلک پائی جاتی ہے وہاں مقامی رنگ بھی ملتا ہے۔ محمود اور فیروز اسی دور کے ایسے شاعر ہیں جن کو بعد کے شعرا نے اپنا استاد تسلیم کیا ہے۔ قطب شاہی دربار کا ایک ممتاز نثر نگار ملا وجہی شاعر بھی تھا۔ اس کی مثنوی قطب مشتری میں چند غزلیں بھی شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اعلیٰ درجے کا غزل گو بھی تھا۔ ملک الشعرا نصرتی بھی دکنی دور کا قابلِ ذکر شاعر ہے۔ غواصی بھی اسی عہد کا ایک ممتاز شاعر ہے جس کی مشہور تصنیف مثنوی "طوطی نامہ" ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دکنی شعرا کو مثنوی کی صنف سے زیادہ لگاؤ تھا۔ چنانچہ اس دور میں کثرت سے مثنویاں لکھی گئیں۔

دکنی دور کے سب سے نامور شاعر ولی ہیں جن کو اردو شاعری کا باوا آدم اور اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سمجھا جاتا تھا۔ بعد کی تحقیق نے اس کی تصدیق نہ کی، پھر بھی ولی اردو کا پہلا شاعر ہے جس نے اردو غزل کو برِصغیر پاک و ہند میں فارسی غزل کے مقابلے میں مقبول اور رائج کیا۔ ولی کے کلام کی دو خصوصیات قابلِ غور ہیں۔ انہوں نے دکنی محاورے کو ترک کر کے اپنی شاعری میں فارسی اور ہندی الفاظ کا ایک حسین امتزاج پیدا کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اردو غزل کو فارسی غزل سے ملا دیا۔ چنانچہ وہ سارے مضامین چاہے عشق و عاشقی کے ہوں یا تصوف اور حکمت کے، جو فارسی غزل کا سرمایہ تھے اردو میں بلا تکلف داخل ہونے لگے۔ ولی ۱۷۰۰ء میں دلی آئے اور وہاں کے دیگر مشاہیر کے علاوہ شاہ سعد اللہ گلشن سے بھی ملے جنھوں نے ولی کی شاعری کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔

ولی کی آمد سے پہلے شمالی ہند میں چونکہ فارسی زبان کا غلبہ تھا اس لیے اردو کو محض بولی کی حیثیت سے جانا اور سمجھا جاتا تھا۔ خط و کتابت بھی فارسی زبان میں کی جاتی تھی اور شعر و شاعری کے لیے بھی فارسی زبان ہی مقبول تھی۔ ولی کی شاعری کی شہرت دلی پہنچی اور یہاں کے شعرا نے اس کا مطالعہ کیا تو وہ اس سے بے حد متاثر ہوئے۔ چنانچہ اس زمانے کے اساتذۂ فن نے فارسی زبان کو ترک کر کے ریختہ میں شاعری شروع کی اور اس زبان کا اسلوب اختیار کرنے لگے۔ اس دور کو عام طور پر ایہام گوئی کا دور کہا جاتا ہے۔ ایہام کے معنی یہ ہیں کہ شعر کی بنیاد کسی ایسے لفظ پر رکھی جائے جس کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی قریب کا ہو اور دوسرا بعید کا۔ شعر پڑھتے ہی قاری کے ذہن میں قریب کا معنی آئے لیکن غور و فکر کے بعد دور کے معنی سامنے آئیں اور شاعر کی مراد بھی دراصل معنیٔ بعید ہو اور یوں پڑھنے والا ایک تحیّر کی کیفیت میں مبتلا ہو جائے۔ اس دور کے مشہور شعرا میں شاہ مبارک آبرو، مضمون، شاکر ناجی اور یکرنگ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلد شعرا کو اس طرح کی شاعری کے بے اثر ہونے کا احساس ہو گیا اور انھوں نے اس مذاق شاعری کی اصلاح کی طرف توجہ کی۔ ایسے لوگوں میں سراج الدین علی خاں آرزو اور مرزا مظہر جانِ جاناں وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یوں ایہام گوئی کا دور ختم ہوا۔

ایہام گوئی کے دور کے بعد اردو شاعری اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہوئی۔ اس دور کے اکابر شعرا کی فہرست اگرچہ خاصی طویل ہے لیکن اس میں میر تقی میر سرِ فہرست ہیں۔ میر تقی میر نے غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، قطعے سب کچھ کہے ہیں لیکن اُن کی شہرت بڑی حد تک ان کی غزل سے ہے اور اس فن میں ان کی استادی کا اعتراف ان کے عہد میں اور ان کے بعد بھی ہر دور کے بڑے بڑے شعرا نے کیا ہے جن میں غالب، ناسخ اور حسرت بھی شامل ہیں۔ میر کی غزلیں ان کے حال کا آئینہ ہیں۔ ان کی زندگی مسلسل کرب، اذیت اور تکلیف کی زندگی تھی۔ مایوسی اور ناکامی ان کی قسمت میں لکھی تھی۔ محبت کی تو

ناکام رہے۔ فارغ البالی اور معاشی اطمینان انھیں زندگی بھر نصیب نہ ہوا۔ بچپن ہی میں یتیم ہو گئے تھے۔ عزیز واقارب نے ایسی سختی برتی کہ آگرہ سے غریب الوطن ہو کر دلی آئے اور پھر لکھنؤ جانا پڑا۔ ایسے شاعر کا کلام اس کے دردِ دل کی تصویر نہ ہوگی تو کیا ہوگی۔ درد والم اور سوز وگداز ان کی شاعری کے اجزا ہیں۔ درویشی، قلندری اور تصوف کے مضامین بکثرت ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، ناپائیداری اور گردشِ روزگار کا ذکر بھی بار بار ملتا ہے۔ عشق ومحبت میں ناکامی اور مایوسی کے مضامین انھیں پسند ہیں اور ان تمام مضامین کو وہ بڑی صفائی اور سادگی سے بیان کرتے ہیں۔ خیال اور بیان کی سادگی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ عام طور پر چھوٹی بحریں پسند کرتے ہیں لیکن طویل بحروں میں بھی بہترین غزلیں موجود ہیں۔ ان سب عناصر نے مل جل کر ان کے کلام کو ایسا اثر بخشا ہے کہ ان کے بعض اشعار نشتر کہلاتے ہیں کہ سنتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں۔

مرزا رفیع سودا اس دور کے دوسرے مشہور شاعر ہیں۔ ان کی غزل گوئی کو بعض لوگ ان کے قصائد کے مقابلے میں کم تر درجہ دیتے ہیں۔ غزل اور مثنوی میں بھی اگرچہ ان کے بعض اچھے نمونے موجود ہیں لیکن سودا کا مزاج اور ماحول قصیدے کا تھا۔ انھوں نے بزرگانِ دین کی مدح کے علاوہ اپنے زمانے کے رئیسوں اور امیروں کی شان میں قصیدے لکھے اور قصیدہ نگاری کے فن کے لوازم کو بہترین طریقے سے نبھایا۔ خیال کی بلندی اور زبان وبیان کا شکوہ ان کے قصیدوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ وہ اردو کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے قصیدہ نگاری کو باقاعدہ فن کی حیثیت سے انتہائی بلندیوں تک پہنچایا۔ اسی لیے انھیں بجا طور پر اردو قصیدہ نگاری کا امام کہا جاتا ہے۔ غزلوں اور قصیدوں کے علاوہ ان کی چند نظمیں اور ہجویات ایسی بھی ہیں جن سے ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی معاملات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس دور کے تیسرے نامور شاعر خواجہ میر درد ہیں۔ یہ صوفی بزرگ تھے اور دلی میں درویشی کی مسند پر بیٹھے قناعت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ شاعری کو انھوں نے پیشہ نہیں بنایا لیکن جو کچھ لکھا ہے وہ منتخب ہے۔ اسی لیے ان کا کلام مختصر ہے۔ ان کی غزلیں عارفانہ کلام کا مثالی نمونہ ہیں۔ توکل، استغنا، ایثار، خود شناسی، خودنگری، تزکیۂ باطن اور خدمتِ خلق کے مضامین ان کے ہاں بار بار ملتے ہیں۔ ان کی غزلیں مختصر ہیں اور زبان وبیان میں سادگی ہے۔

میر وسودا کی شاعری کے اس دور کو دبستانِ دہلی کا دور کہا جاتا ہے کیونکہ بعض خصوصیات اس دور کے تمام شعرا میں قدرِ مشترک کے طور پر موجود تھیں۔ مثلاً دلی جذبات واحساسات اور ان کے بیان میں جذبے کا خلوص وصداقت، تہذیب ومتانت، رمز وکنایہ، تصوف، اظہار کی سادگی اور زبان کی صفائی وغیرہ۔ اس عام انداز کی بنا پر ہی کہا جاتا ہے کہ دہلوی دبستانِ شاعری داخلی شاعری کا نمونہ ہے۔

اس دور کے بعد وہ عہد آتا ہے جب دلی میں شاعری کی محفلیں اجڑنے لگیں اور شاعر یہاں سے ہجرت کر کے فیض آباد اور لکھنؤ جانے لگے۔ ان شعرا میں میرؔ، سوداؔ، میر حسنؔ، مصحفیؔ، انشاؔ اور جراتؔ قابلِ ذکر ہیں۔ لکھنؤ میں یہ زمانہ ایک نئی تہذیب کے عروج کا زمانہ تھا۔ دولت کی افراط تھی۔ لوگوں کو بڑی حد تک معاشی فارغ البالی نصیب تھی۔ درباروں میں اربابِ فن کی قدر دانی ہوتی تھی۔ اس لیے دلی جو مغلیہ سلطنت کے زوال اور مرہٹوں اور سکھوں کی آئے دن کی شورشوں سے شدید بدحالی کا شکار تھا، یہاں سے لوگ ہجرت کر کے لکھنؤ پہنچ گئے لیکن یہاں پر بعض ایسی روایات پیدا ہو گئیں جو عیش وعشرت اور معاشی فارغ البالی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ شاعری پر جو رنگ صوفیوں اور بزرگوں کی کاوشوں سے چڑھا تھا اور دلی کی تہذیب کی متانت اور سنجیدگی نے جسے ایک حد تک ضبط ونظم کی تعلیم دی تھی، اب لکھنؤ کے درباروں میں رئیسوں کی تفریحِ طبع کا ایک مشغلہ بن گئی۔ شاعری میں اعلیٰ جذبات کی جگہ ہوا وہوس کے مضامین غالب آگئے۔ ایسی شاعری نہ اخلاقی اعتبار سے اور نہ ہی جمالیاتی اور فنی اعتبار سے اعلیٰ درجے کی شاعری کہلا سکتی ہے۔ اس دور میں غزلیں، مثنویاں، قصیدے اور مرثیے سب کچھ کہے گئے۔ غزلوں میں مصحفیؔ کے یہاں کسی قدر سنجیدگی اور انشا کے ہاں اثر آفرین اشعار موجود ہیں لیکن جراتؔ کو خاص طور پر ایسے مضامین میں شہرت حاصل ہے جنھیں معاملہ بندی کے مضامین کہتے ہیں۔ میر حسنؔ بھی اس دور کے ایک ممتاز شاعر ہیں جن کی اصل شہرت ان کی مثنوی ''سحر البیان'' پر قائم ہے۔ جتنی خوبیاں اس ایک مثنوی میں جمع ہیں، اردو میں کسی اور مثنوی میں مشکل سے ملیں گی۔

شاعری کا وہ دور جسے دبستانِ لکھنؤ کا نام دیا جاتا ہے، اس کے بعد کا دور ہے جس میں امام بخش ناسخؔ اور خواجہ حیدر علی آتشؔ مشہور ہیں۔ ناسخؔ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی توسیع وتصحیح کے لیے خاص کوشش کی۔ ہندی اور بھاشا کے الفاظ ترک کر کے فارسی اور عربی کے الفاظ استعمال کرنے کی طرف توجہ دی۔ بہت سے الفاظ کو متروک قرار دیا اور بہت سے الفاظ ومحاورات میں مناسب تبدیلیاں کیں اور صرف ونحو کو درست کیا۔ چنانچہ ناسخؔ کی غزلیں شاندار الفاظ اور تشبیہات سے بھری ہوئی ہیں۔ تصنع اور بناوٹ ان کے کلام کا اصل جوہر ہے لیکن ان کے اشعار جذبات وتاثرات سے

خالی ہیں۔ آتش کی شاعری ناسخ کی شاعری سے مختلف ہے۔ ان کے ہاں اگر چہ لکھنوی شعرا کی سی رنگین مزاجی نہیں ملتی لیکن ان کے ہاں خارجیت کی جانب واضح رجحان ملتا ہے۔ آتش کا لہجہ مردانہ ہے جو زندگی کی حرارت اور عزم سے بھرپور ہے۔ ان کے ہاں غم و درد کا ذکر بہت کم ہے اور وہ بھی زندگی سے مایوسی اور بیزاری نہیں سکھاتا۔

دبستانِ لکھنؤ کی شاعری کے مخصوص رجحان کو کسی قدر گوارا بنانے میں لکھنؤ کے مرثیہ گو شعرا نے اہم کردار ادا کیا۔ مرثیہ گوئی کو لکھنؤ میں ایسی ترقی نصیب ہوئی کہ اس نے شعرائے لکھنؤ کی خامیوں کی بڑی حد تک پردہ پوشی کر لی۔ مرثیہ گو شعرا ضمیر، دلگیر، خلیق، انیس اور دبیر نے مرثیہ کو معراجِ کمال پر پہنچا دیا۔ انیس اور دبیر خاص طور پر مرثیے کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔

دہلی اور لکھنؤ کے ان ادبی مراکز سے دور آگرے کے نزدیک اکبرآباد میں نظیر نے اپنی ایک الگ دنیا بنا رکھی تھی۔ نظیر نے طویل عمر پائی اور ان کے ہم عصر شعرا میں میر سے لے کر آتش و ناسخ شامل ہیں۔ ان سب شعرا کے مقابلے میں نظیر اکبرآبادی کو عوامی شاعر یا انسان دوست شاعر کہا جا سکتا ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں، جنھوں نے عوام کو موضوعِ شعر کا مستحق سمجھا اور ان کی زندگی کو پیش کر کے ان کی انسانیت کو نمایاں کیا۔ وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے اور ان کی نظموں کے موضوعات کا تعلق ہماری زندگی سے ہے لیکن ان نظموں میں عوامی زندگی کا جو شعور پایا جاتا ہے، اس کی کوئی مثال ان سے پہلے اور ان کے بعد کم ہی نظر آتی ہے۔

اسی دور میں دلی میں ایک بار پھر اردو شاعری نے غالب کے روپ میں اپنا کمال دکھایا۔ مرزا غالب نہ صرف اردو غزل بلکہ پوری اردو شاعری کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ ایک فلسفی کا ذہن اور شاعر کا مزاج رکھتے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری میں فکر کی گہرائی بھی ہے اور فن کار کی نزاکت بھی۔ خیال اور جذبے کی جیسی ہم آہنگی مرزا غالب کے کلام میں ملتی ہے، اس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے۔ غالب کی انفرادیت کا سبب محض ان کی مشکل پسندی یا فارسی نہیں بلکہ ان کے ہاں قدم قدم پر مضمون اور اس کے ادا کرنے میں جدت اور ندرت پائی جاتی ہے، یہی ان کی انفرادیت ہے۔

مومن خاں مومن بھی غالب کے ہم عصر تھے اور ایک کامیاب غزل گو شاعر تھے۔ انھوں نے غزل کے رسمی اور روایتی مضامین کو اس نزاکت، تازگی اور جدت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کی مثال ملنا بہت مشکل ہے۔ بہادر شاہ ظفر اور ذوق بھی اسی دور کے شاعر ہیں۔ بہادر شاہ ظفر سلطنتِ مغلیہ کے آخری فرماں روا تھے۔ چونکہ ان کی بادشاہت برائے نام تھی اور وہ ایک درویش مزاج انسان کی حیثیت سے زندگی گزار رہے تھے اس لیے ان کے کلام میں حسرت و یاس کے مضامین کا پایا جانا ایک قدرتی امر ہے۔ ذوق نے اگر چہ غزلیں بھی کہی ہیں لیکن ان کا مزاج دراصل قصیدے کا مزاج تھا۔ اس لیے انھوں نے قصیدہ گوئی میں بڑی شہرت پائی۔

۱۸۵۷ء کا انقلاب جہاں برصغیر میں بہت سی سیاسی تبدیلیاں لایا وہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی تبدیلیاں لانے کا باعث بنا۔ لاہور میں انجمنِ پنجاب کے نام سے ایک انجمن قائم ہوئی جس کا مقصد مشرقی زبانوں کی ترقی اور ان کی تعلیم و تدریس تھا۔ اس انجمن کے تحت شاعروں کا عام انداز بدل کر شعرا کو ایک مقررہ موضوع پر اظہارِ خیال کی دعوت دی جاتی تھی۔ ان شاعروں میں مولانا محمد حسین آزاد اور مولانا حالی پیش پیش ہوتے تھے۔ یہیں سے اردو شاعری کا دورِ جدید شروع ہوتا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رسمی، روایتی اور فرسودہ عاشقانہ مضامین کی جگہ نئے نئے موضوعات پر ایک حقیقت پسندانہ انداز میں طبع آزمائی کی گئی اور شاعری کو زندگی سے قریب تر لا کر اس کا ترجمان بنانے کی کوشش کی گئی۔ چھوٹی چھوٹی تاریخی، اصلاحی اور حب الوطنی کے موضوع پر نظمیں کہی جانے لگیں جس سے آہستہ آہستہ قومی شاعری کا شعور واضح ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا حالی کی مشہور نظم "مدّ و جزرِ اسلام" جو "مسدسِ حالی" کے نام سے مشہور ہے، قابلِ ذکر ہے۔ حالی کی اس نظم کو اردو میں قومی شاعری کا نقطۂ آغاز کہا جا سکتا ہے جس کا سلسلہ بعد میں اکبر، اقبال اور جوش تک پہنچا۔

اکبرالہ آبادی بھی اس عہد کے شاعر ہیں لیکن اپنے نقطۂ نظر اور مسلک میں وہ خالص مشرقی اور بڑی حد تک روایت پرست نظر آتے ہیں۔ انھیں سرسیّد کا مخالف سمجھا جاتا ہے حالانکہ وہ مغرب اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثرات کے خلاف تھے۔ ان کی شاعری نے قومی زندگی میں مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے رجحان کے خلاف ایک کمزور ہی سہی لیکن آواز ضرور بلند کی جس سے آگے چل کر اقبال نے قوت، طاقت اور حرارت حاصل کی۔

اردو شاعری کے دورِ جدید میں اقبال بلاشبہ سب سے ممتاز ہیں۔ ان کی شاعری میں نئے موضوعات اور مباحث بھی ہیں اور نیا اسلوب اور آہنگ بھی۔ اقبال نے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک انگلستان میں قیام کیا۔ اس عرصے میں ان کے خیالات اور افکار میں ایک انقلاب عظیم آیا۔ مغربی تہذیب ان کے سامنے بے نقاب ہوگئی۔ فلسفہ اور مغربی افکار و خیالات نے ان میں وسعتِ نظر پیدا کی اور ان کی شاعری میں فکری پہلو زیادہ نمایاں ہونے لگا۔ ان کے نزدیک عصر جدید میں مسلمانوں کے ذہنی انتشار، سیاسی انحطاط اور معاشی بدحالی کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے بعض ایسے تصورات کو قبول کر لیا تھا جو روحِ اسلامی کے منافی تھے۔ عجمیت، ویدانت کے فلسفے اور بدھ مت کی تعلیمات نے انھیں حرکت و عمل سے دور کر دیا تھا۔ اس اندازِ فکر کو انھوں نے نفی خودی کہا ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی اثبات خودی کا نام ہے اور یہ مسلسل جدوجہد، عزم و استقلال اور عملِ پیہم سے عبارت ہے۔ اقبال نے اسی تصور کو بنیاد بنا کر اپنے فلسفۂ خودی کی عمارت کھڑی کی اور اپنی شاعری کو اس طرح قومی راہنمائی کا ذریعہ بنایا کہ وہ برصغیر میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے سب سے بڑے علمبردار قرار پائے۔

اس عہد کے ایک اور نامور شاعر مولانا ظفر علی خاں ہیں۔ شاعر کے علاوہ وہ صحافی اور سیاستدان بھی تھے۔ ان کی طبیعت میں بلا کی آمد تھی۔ ان کی شاعری کے موضوع عام طور پر سیاسی اور تازہ ترین حالات سے متعلق ہوتے تھے۔ اس لیے ان کا کلام وقتی طور پر دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے نعتیں بھی لکھیں جو اردو کی نعتیہ شاعری میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔

اردو کے دورِ جدید میں جن اکابر شعرا نے نظم کی روایت کو پروان چڑھایا ان میں جوش ملیح آبادی بھی شامل ہیں۔ جوش کے ادبی ورثے میں لکھنؤ کی پوری تہذیب، ادبی مذاق، صحتِ زبان کا لحاظ اور شاعرانہ فنکاری ملتی ہے۔ جوش کا کینوس بہت وسیع ہے۔ وہ شاعرِ فطرت ہیں، شاعرِ شباب ہیں اور شاعرِ انقلاب ہیں۔ ان کے کلام میں ایک جوش اور ولولہ اور ان کے لہجے میں ایک مردانگی اور ان کی فکر میں عہدِ حاضر کا شعور ملتا ہے۔ زبان پر جیسی قدرت انھیں حاصل ہے وہ اردو شعرا میں نظیر اکبر آبادی اور میر انیس کے سوا کسی اور میں نظر نہیں آتی۔ اختر شیرانی اور حفیظ جالندھری نے بھی نظم کی آبیاری میں اہم کام سرانجام دیا۔

جدید نظم کے عام رواج کے بعد غزل کا دور ختم ہوتا نظر آتا تھا لیکن بعض شعرا نے غزل کو موضوع اور اسلوب بیان دونوں کے اعتبار سے ایک نئی زندگی عطا کی۔ ان شعرا میں حسرت موہانی سرِ فہرست ہیں۔ ان کی طبیعت نے پرانے اساتذہ میں سے ہر ایک سے فیض اٹھایا ہے۔ عاشقانہ شاعری میں انھوں نے ایسے واقعات اور معاملات بیان کیے ہیں کہ جرات، مومن اور داغ کے رنگ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تصوف کے مضامین ادا کرتے ہیں تو درد کی یاد دلاتے ہیں۔ ہجر و فراق اور سوز و گداز کے مضامین بیان کرتے ہیں تو میر کا انداز جھلکنے لگتا ہے۔ اسی سلسلے کے دوسرے شاعر فانی بدایونی ہیں جن کے کلام میں غالب کا فکری انداز اور میر کا سا سوز و گداز ملتا ہے۔ تیسرے شاعر اصغر گونڈوی ہیں جن کا کلام میر درد کی طرح مختصر لیکن منتخب ہے۔ جگر مراد آبادی بھی اسی حلقے کے ایک نامور غزل گو ہیں۔ ان کی رندی و سرمستی ایک حقیقت ہے اور ان کی غزلیں ان کے حسبِ حال ہیں۔

۱۹۳۵ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا۔ اس تحریک سے وابستہ لوگوں کے نظریات کے پرچار کا ذریعہ شاعری تھا۔ چنانچہ ترقی پسند شعرا میں علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، اسرار الحق مجاز، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، جان نثار اختر، مجروح سلطان پوری، شکیل بدایونی اور حبیب جالب اہم ہیں۔ ان لوگوں کے ہاں زیادہ تر جذباتیت پائی جاتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی اردو شاعری میں آزاد اور معریٰ نظم کا رواج ہوا۔ آزاد نظم میں وزن تو ہوتا ہے مگر بحر چھوٹی بڑی اور قافیہ نہیں ہوتا۔ معریٰ نظم میں بحر موجود ہوتی ہے یعنی ہر مصرع چار ارکان کا ہونا ضروری ہے لیکن ہم قافیہ ہونا ضروری نہیں۔ اردو میں اس شاعری کا آغاز اسمٰعیل میرٹھی سے ہوتا ہے۔ بعد ازاں ن۔م۔راشد، تصدق حسین خالد، ڈاکٹر تاثیر، فیض، مختار صدیقی، قیوم نظر، یوسف ظفر، اختر الایمان اور مجید امجد زیادہ مشہور ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد نظم کے میدان میں وزیر آغا، عارف عبدالمتین، عبدالعزیز خالد، منیر نیازی، صفدر میر، جیلانی کامران، ظہور نظر، جعفر طاہر، افتخار جالب، عباس اطہر، اختر حسین جعفری، ریاض مجید، آفتاب اقبال شمیم وغیرہ مشہور ہوئے جبکہ غزل گو شعراء میں ناصر کاظمی، احسان دانش، شہزاد احمد، احمد فراز، جمیل ملک، باقی صدیقی، محسن احسان، اختر ہوشیارپوری، عزیز حامد مدنی، احمد مشتاق، ناصر زیدی، کشور ناہید، ادا جعفری، فہمیدہ ریاض اور پروین شاکر وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔